مقتلِ غزل

ساغر صدیقی

آئینۂ ادب چوک مینار انار کلی لاہور

اَچھّی
کتاب
کا
نِکھار
ہمیشہ
قائم
رہتا
ہے!

مقتلِ گل

ساغر صدیقی

مرتب:

محمد عبداللہ قریشی

آئینہ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور

پہلی بار : ۱۹۷۴ء

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : چار روپے پچاس پیسے

کتابت : نذیر ہاشمی

اہتمام

م، ع، سلام - آئینۂ ادب

چوک مینار، انارکلی، لاہور

فون نمبر : ۶۷۵۰۴

قاضی آرٹ پرنٹرز، لاہور

غم فروزاں ہو گئے ہیں ہر خوشی لُٹنے کے بعد
کتنی دِلکش ہو گئی ہے زندگی لُٹنے کے بعد

سنوارو گے کبھی زُلفِ پریشاں، ہم نہیں ہوں گے
چمن میں چاندنی ہوگی غزل خواں، ہم نہیں ہوں گے

ترتیب

پیش گفتار

ساغرؔ صدیقی اپنی اُجڑی پجڑی، لُٹی پٹی، بے رونق اور سنسان زندگی کی صفیں لپیٹ کر ۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء کو اپنی شخصیت کے تمام اچھے بُرے نقوش، تمام محاسن و معائب، تمام راز اور تمام اَسرار اپنے دامن میں سمیٹ کر چُپ چاپ قبر کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ اُس کے جاننے والوں کو اس سانحہ کی خبر اس وقت ہی جب وُہ پیوندِ خاک ہو چکا تھا۔ اب کوئی شخص اسے کالی چادر اوڑھے، ننگے سر، ننگے پاؤں، بکھرے بالوں اور پچکے گالوں کے ساتھ سگریٹ کے دُھنوئیں اُڑاتا لاہور کی سڑکوں پر چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ جسم فانی تھا، فنا کے گھاٹ اُتر گیا۔

مگر حسین کارِ قدرت نے اسے ایک شاعر کا دِل و دماغ اور شاداب ذہن بھی عطا کیا تھا جو اسے ایسے لافانی شعر کہنے پر مجبور کرتا تھا جو ظلماتِ شام میں ستارہ بن کر چمکتے تھے۔ ساغرؔ کے فکر و خیال کے یہ روشن ستارے "غمِ بہار"، "نوحِ جنوں"، "شیشۂ دل"، "شبِ آگہی" وغیرہ جھرمٹوں میں اب بھی جگمگا رہے ہیں اور اپنی تابانی سے مرنے والے کا نام تا ابد روشن رکھیں گے۔

اپنی وفات سے پندرہ بیس برس پیشتر ساغرؔ ایک اچھا خاصا صحت مند

نوجوان تھا۔ اس کی رگوں میں زندگی کا جوان خُوں رقص کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر تازگی، آنکھوں میں نُور اور آواز میں ایک دلکش لوچ تھا اور وہ ہر ادبی محفل کی جان سمجھا جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی جان کو کچھ ایسا روگ لگا لیا کہ اس کی صحت اور جوانی برباد ہو کر رہ گئی۔ وُہ خود کہتا ہے ؎

غم فروزاں ہو گئے ہیں ہر خوشی لُٹنے کے بعد

کتنی دِلکش ہو گئی ہے زندگی لُٹنے کے بعد

ساغؔر میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟ کیا اس نے اپنی قبر خود کھودی یا ظالم معاشرے کی بدسلوکی نے اسے دُنیا تج کر درویشانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کیا؟ یہ اور اس قسم کے کئی سوال اس کے دوستوں اور ہمدردوں کے ذہن میں اُبھرتے تھے مگر ساغؔر ہمیشہ طرح دے جاتا تھا اور کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔ سیّد "م" سلیم یزدانی بھی ایسے ہی ہمدردوں میں تھے جو حقیقتِ حال سے واقف ہونے کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ ایک روز وُہ اسی نیّت سے ساغؔر کی تلاش میں نکلے۔ ایک جگہ ملاقات ہو گئی۔ سلام دعا اور مزاج پُرسی کے بعد باتوں باتوں میں انھوں نے دو ایک سوال کر ڈالے اور کئی راز اگلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اُنھوں نے ساغؔر کی بکھری بکھری اور بے ربط باتوں کو معمولی سے پیوند لگا کر ایک کڑی میں پرو دیا اور اُنھی کے الفاظ میں پیش کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہم ان باتوں سے کبھی واقف نہ ہو سکتے۔ مَیں اُن کا

شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بہ کمال مروّت مجھے ان کی نقل حاصل کرنے اور ساغر کے آخری مجموعۂ کلام "مقتلِ گُل" میں شامل کرنے کی اجازت دے دی۔

سیّد "م" سلیم یزدانی کے مختلف سوالوں کے جواب میں ساغر صدیقی مرحوم نے بتایا:

"میری زندگی زندان کی ایک کڑی ہے۔ ۱۹۲۸ء کے کسی ماہ میں پیدا ہُوا ہُوں۔ گھُٹنوں کے بل چلنے کا زمانہ سہانپور اور انبالہ کی آغوش میں گزرا۔ انبالہ اُردو اور پنجابی بولنے والے علاقے کا سنگم ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، کہاں اور کیسے پیدا ہُوا ہوں؟ یہ میرے لیے "کسی مقدس سرائے کے غلیظ باڑے میں" کے سوا کچھ بھی نہیں، یا علی بابا چالیس چور" کے پُر اسرار غار کی کہانی ہے۔ مَیں نے دُنیا میں خُداوندِ رحیم و کریم سے بھائی بہن کا عطیہ بھی نہیں پایا۔ یہ معلوم نہیں خُدا کو اس تنہائی سے یگانہ بنانا مقصود تھا یا بیگانہ؟ بہر حال شاید میری تسکین قلبی کے لیے کسی کا نام بھائی رکھ دیا ہو۔ اس طرح ایک وجود کا تذکرہ میرے بارے میں لکھنے والوں نے کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ دُنیا کی چھ سمتوں پر نظر رکھنے والے صاحبِ فراست لاہور کی سڑکوں پہ مجھے جب چاہیں ٹوٹا ہُوا بازو، کالی کملی میں چھپائے، احساس کے اُلٹے پاؤں سے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی بھائی بہن ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا۔ مَیں نے لوگوں سے اپنا نام محمدؐ اختر سُنا۔ البتہ ایک پُر شکوہ ماضی کی سرسراہٹ میں نے اپنے

پاؤں کے نیچے محسوس کی ہے۔

۱۹۳۶ میں جب ذرا سُوجھ بُوجھ کا زمانہ آیا تو ایک ویران مکان کی افسردہ دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے لکڑی کے پُرانے صندوقوں میں دیمک چاٹتی ہوئی کتابیں دیکھیں۔ شاید ان کے پڑھنے والے، ۱۸۵۷ء کی گھٹاؤں میں ڈوب چکے تھے، ہاں رات کی تاریکی میں ایک گگر پر روشنی پھیلانے کی جستجو کرتا ہُوا ایک دِیا میرے مشاہدے کی پہلی چیز تھی، اس گھر میں مجھ سے پہلے حاجی محمد حنیف اَور حاجی محمد حسین نام کے دو بزرگ آباد تھے۔ یہ کتابیں شاید انھیں کی تھیں۔ یہ بزرگ انبالہ شہر کی سماجی زندگی میں اچھی خاصی شہرت کے حامل تھے۔ ان کی پکّی اور بیل بوٹوں والی قبر کا کوئی پتھّر شاید آج بھی وہاں کے قبرستان کے کسی کونے میں موجود ہو۔

مَیں نے اُردو اپنے گھر میں پڑھی۔ ایک چالیس پچاس سالہ بزرگ جن کا نام حبیب حسن تھا، بچّوں کی تربیت و تعلیم کا بہت ذوق رکھتے تھے۔ یہیں مجھ میں شاعری کا شوق پیدا ہُوا۔ میری عُمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی کہ مَیں اُردو میں اتنی مہارت حاصل کر چکا تھا کہ اکثر خط لکھوانے والے اپنی گذارشات کو میرے اندازِ بیان میں سُن کر داد و تحسین سے نوازتے تھے۔ مَیں نے بچپن کا دَور بھی غربت میں صبر و شکر سے گزارا ہے۔ جو کچھ مِلتا اسی پر بخوشی قناعت کرتا۔ اُس وقت کے تمام اُردو روزناموں زمیندار،

احسان، انقلاب) کا مطالعہ میرا شغل تھا۔ مَیں یقین سے کہہ سکتا ہُوں کہ شاید ہی مَیں نے آج تک اُردو زبان کا کوئی لفظ غلط پڑھا یا لکھا ہو۔

مَیں نے شروع میں ناصؔر حجازی تخلص رکھا، تقریباً دو ماہ ــ پھر مجھے یہ تخلص واضح دکھائی نہ دیا۔ تب مَیں نے اپنا تخلّص ساغؔر صدّیقی پسند کیا، جو اَب تک موجود ہے۔ دس بارہ برس کی عمر میں، مَیں اپنے اُستاد حبیب حسن کے ساتھ امرتسر میں رہا کرتا تھا۔ مَیں چھوٹی عمر میں بھی بیس بائیس سال کا سنجیدہ نوجوان معلوم ہوتا تھا، میری عمر سولہ سال کی تھی جب ۱۹۴۴ء میں امرتسر کے جامعہ السنہ شرقیہ ہال بازار میں جوکہ علوم شرقیہ کی بہترین درس گاہ تھی، ماہانہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے، ان میں شرکت کرنا میرے لیے سب سے بڑی خوشی کی بات تھی۔ ۱۹۴۴ء ہی میں اُردو مجلس کے نام سے ڈاکٹر تاثیؔر مرحوم اور شمس العلما تاجوؔر نجیب آبادی (دیال سنگھ کالج لاہور میں پروفیسر رہے) کے زیرِ سایہ ایک بزم قائم ہُوئی۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی اس کے اغراض و مقاصد تھے۔ اُس کے مشاعروں میں بھی باقاعدہ شریک ہوتا رہا ہوں۔ امرتسر میں عرؔشی امرتسری، شمؔس مینائی مرحوم، فرخؔ امرتسری، مرزا بیضاؔ خاں مروی ایرانی، عیسیٰؔ امرتسری اِن لوگوں نے میری صلاحیتوں اَور خوبیوں کو بہت سراہا۔

۱۹۴۵ء میں ولی صابر علیہ الرحمۃ کے مشہور کلیر کے عُرس میں شرکت کی۔

کلیر میں عُرس مبارک کے موقع پر تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کے تمام اہلِ فن اکٹھے ہوتے تھے۔ عُرس کے آخری ایّام میں کاشانۂ احباب سہارنپور ایک بزمِ شعر و سخن منعقد کرتے تھے جس میں چیدہ چیدہ شعرائے کرام شامل ہوتے تھے۔ انور صابری نے اس محفل میں میرا تعارف کروا دیا۔ دِلّی میں نواب سائل قلعہ معلّیٰ اُردو کے نقش آخری تھے۔ ان کو کلام سُنایا۔ تحسین کے پھول سمیٹے اور مرقدِ غالبؔ کی زیارت کی۔

امرتسر میں دوسری جنگِ عظیم کی باغی آزاد فوج کے تین جرنیلوں کے استقبال کے لیے جلیانوالہ باغ میں تقریباً تیس چالیس ہزار کے مجمع میں، مَیں نے زندگی میں پہلی بار اسٹیج پر آکر نظمیں پڑھیں۔ اس جلسہ میں پڑھی جانے والی نظم کا ایک شعر اور ایک مصرع مجھے یاد ہے جو یوں تھا

؎ ہو جس کا رُخ ہوائے غلامی پہ گامزن
اس کشتیٔ حیات کے لنگر کو توڑ دو

ع تہذیبِ نَو کے شیشہ و ساغر کو توڑ دو

امرتسر میں امینؔ گیلانی پہلے ادبی دوست تھے۔ نفیسؔ خلیلی مرحوم، ظہیرؔ کاشمیری، احمدؔ راہی، مرزا جانبازؔ سے نشست و برخاست رہی۔ ساحرؔ لدھیانوی، نریش کمار شادؔ، لطیف انور گورداسپوری مرحوم، جن کا مَیں علم و ادب کے میدان میں بے حد احترام کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔

میری یادداشت کا ابتدائیہ ہیں۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے جیّد عالم کے دستِ شفقت سے سرفراز ہُوا۔ لدھیانہ میں مولانا عزیز الدین عظامی مرحوم سے ملا جو مولانا گرامی مرحوم کے شاگرد اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ جالندھر، لدھیانہ اور گورداسپور کے کئی مشاعروں میں شرکت کی۔"

یہ ساغر کی آپ بیتی کا ایک مختصر سا ورق ہے۔ افسوس کہ اس سے زیادہ وُہ کچھ نہ بتا سکے۔ اُن کی ایک غزل کے چند اشعار شاید اُن کے دلی جذبات کی ترجمانی کر سکیں ؏

اَب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنّم رقصاں ہے
بیدادِ مشیّت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے میخانے میں کہاں، اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدّت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے، کچھ ماضی کے عیّار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کانٹوں سے بھرا ہے دامنِ دل، شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اَب اپنی حقیقت بھی ساغرؔ بے ربط کہانی لگتی ہے
دُنیا کی حقیقت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

ساغرؔ عورت کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، شاید اپنی آوارہ مزاجی کے سبب زندگی کے سفر میں اُسے رفیق نہ بنا سکے۔ لیکن وہ فطری شاعر تھے، بنیادی طور پر فن کار تھے۔ اُن کے ذوقِ جمال میں زندگی تھی اس لیے کچھ عرصہ خوب رُو نوجوانوں کے ساتھ نشست و برخاست میں مگن رہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ساغرؔ لاہور چلے آئے اور جیسے جیسے حالات پلٹا کھاتے رہے، اُن کا شعور پختہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ وہ اَسرارِ کائنات کے رازداں بن گئے۔ یہاں رہ کر اُنھوں نے صرف شعر کہے، شعر پڑھے۔ شعر کھائے اور شعر پیے۔ یہ حالات صرف چند برس رہے۔ معاشرے نے اس جوہرِ قابل کی قدر نہ کی اور وہ کشمکشِ حیات سے تنگ آکر اپنی ہستی خود تباہ کرنے کے درپے ہو گیا۔ یوں اس کی صحت اور جوانی کیف و سُرور کی بھینٹ چڑھ گئی ؎

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغرؔ
تُو لبوں سے مُسکرا کے اسی جام کو لگا لے

ساغرؔ کی غزلوں کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ "زہرِ آرزو" ۱۹۶۰ء میں، "غمِ بہار" ۱۹۶۴ء میں، "لوحِ جنوں" ۱۹۷۰ء میں، "شیشۂ دل" اور "شبِ آگہی" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئیں۔ اُنھوں نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء

کی پاک بھارت جنگوں میں بہت سے ترانے بھی لکھے، نعتیں بھی کہیں جو "سبز گنبد" کے نام سے مجموعے کی صورت میں طبع ہوئیں۔ نعتوں میں —— "بزمِ کونین سجانے کے لیے آپؐ آئے" بہت مقبول ہوئی۔ ۳۵ کے قریب گیت فلموں کے لیے لکھے جن کی موسیقی رشید عطرے مرحوم اور غلام حیدر مرحوم نے ترتیب دی۔ اب ساغرؔ کی وفات کے بعد اُن کی غزلوں کا آخری مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا نام "مقتلِ گُل" مرحوم نے خود تجویز کیا تھا۔ اُمید ہے کلام ساغر کے شیدائی حسبِ سابق اس کی بھی پذیرائی فرمائیں گے۔

محمد عبداللہ قریشی

مُدیر "ادبی دُنیا" لاہور

شانِ درویش

شریعتِ غمِ ہستی سنوّارنے والے
تجلّیوں کو فلک سے اُتارنے والے

خُدا گواہ! کہ کانٹوں پہ رقص کرتے تھے
چمن چمن کا مُقدّر نکھارنے والے

اُفق سے پار بھی جس کا نشاں نہیں مِلتا
بہت قریب سے اُس کو پُکارنے والے

دِلوں کو بخش گئے ہیں قرار کی دولت
تمام عمر تڑپ کر گزُارنے والے

کبھی تھے دار کے قابل کبھی سرِ مقتل
سر و دِل کو نامِ محمّدؐ پہ وارنے والے

احساس گراں بار ہے دِل ڈوب رہا ہے
پژمُردہ چمن زار ہے دِل ڈوب رہا ہے

زنجیر کے حلقے تو سلامت ہیں مری جاں!
سہمی ہوئی جھنکار ہے دِل ڈوب رہا ہے

خاموش ہوئی گرمیٔ بازارِ محبّت
اب کون خریدار ہے دِل ڈوب رہا ہے

○

موجزن وقت کے دریا میں نوائے درویش
ہدیۂ چاک صدف دستِ دُعائے درویش

جب کبھی راستہ حالات کا دھندلایا ہے
کام آئی ہے زمانے میں ضیائے درویش

ہر شگوفے کو چٹکنے کی اجازت دیجے!
نغمۂ صُبحِ بہاراں ہے صلائے درویش

آج اَسرارِ شہنشاہی ہیں دیوانوں میں
آج بیدار ہے ذہنوں میں دفائے درویش

ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ساغؔر کے لئے
غیرتِ قوم و وطن اَور رِدائے درویش

○

غم کی تصویر غزل کے اشعار
خوں کی تحریر غزل کے اشعار

اُن سے تدبیر کی شمعیں روشن
سوزِ تقدیر غزل کے اشعار

داغ کہتے ہیں محبّت کے جنھیں
اُن کی تنویر غزل کے اشعار

گیسوئے وقت کو سُلجھاتے ہیں
درد شبّیر غزل کے اشعار

ان میں پیکاں ہیں تری آنکھوں کے
دار و شمشیر غزل کے اشعار

نالہ و شیون و فریاد کی لَے
رقصِ زنجیر غزل کے اشعار

اَے غمِ یار تصوّر تیرا !
تیری توقیر غزل کے اشعار

گُل جو کِھلتے ہیں خزاں میں ساغؔر
اُن کی تفسیر غزل کے اشعار

پھول چاہے تھے مگر ہاتھ میں آئے پتھر۔
ہم نے آغوشِ محبّت میں سُلائے پتّھر!

وحشتِ دِل کے تکلّف کی ضرورت کے لئے
آج اُس شوخ نے زلفوں میں سجائے پتّھر

اُن کے قدموں کے تلے چاند ستارے دیکھے!
اپنی راہوں میں سُلگتے ہُوئے پائے پتّھر!

میَں تری یاد کو یوں دِل میں لئے پھرتا ہُوں
جیسے فرہاد نے سینے سے لگائے پتّھر

فکرِ ساغؔر کے خریدار نہ بھُولیں گے کبھی!
میَں نے اشکوں کے گہُر تھے جو بنائے پتّھر

○

سکوتِ غم سے جو گذرے نہ پھر ملی آواز
یہیں کہیں اِنھی گلیوں میں کھو گئی آواز

یہ کہکشاں مرے نغمات کی لڑی یارو!
کرن کرن کی سماعت میں ہے مری آواز

بہت دنوں سے ہے پامال دِل کا ہر غنچہ!
مَیں منتظر ہوں کوئی آئے شبنمی آواز

نہ چھیڑ عُذرِ محبت کی داستاں اے دوست
کہ بزمِ عشق میں ہوتی ہے خامشی آواز

مَیں خود نگر ہوں کسی موڑ پر نہ ٹھہروں گا
ازل سے دیتی رہی مجھ کو زندگی آواز

شبِ فراق کوئی گُنگُنا کے گُزرا ہے
کہ بن گئی ہے ستاروں کی روشنی آواز

خُدا کرے کہ ستاروں کو چھُو سکے ساغر
سرُودِ زیست کے پردوں میں ڈوبتی آواز

○

ہنس نہیں سکتے شگوفے تازگی سے رُوٹھ کر
ہم زمانے میں جیئے ہیں زندگی سے رُوٹھ کر

زُلفِ جاناں سے ملی فکر و نظر کی چاندنی
ظلمتیں ہم نے نکھاریں روشنی سے رُوٹھ کر

خود منانے کے لئے آئے مجھے دَیر و حرم
سجدۂ الہام پایا بندگی سے رُوٹھ کر

غم سے رونق ہو گئی کاشانۂ تقدیر میں
مُطمئن ہے دِل کی دُنیا ہر خُوشی سے رُوٹھ کر

ایک دن ساقی یہی ٹُوٹے ہُوئے جام وسبُو!
میکدے ترتیب دیں گے تشنگی سے رُوٹھ کر

سوچتے ہیں حسرتوں کے موڑ پر شام و سحر
جائیں گے ساغر کہاں اُن کی گلی سے رُوٹھ کر

○

بن گئے اشک جفا کی تصویر
کھنچ گئی آج صدا کی تصویر

احتیاطِ دلِ عاشق لازم
ٹوٹ جاتی ہے وفا کی تصویر

فصلِ گُل اور چٹکتے غنچے
تیری مخمور ادا کی تصویر

پھر بجا نالہ و شیون کا سُرود
رقص کرتی ہے صبا کی تصویر

جگمگاتی ہے غمِ ہستی کے
رنگ و روغن سے قضا کی تصویر

بول اُٹھی تری لَے میں ساغر
آسمانوں پہ دُعا کی تصویر

○

ہم بیخود و سرشار سدا زندہ رہیں گے
حالات کے میخوار سدا زندہ رہیں گے

کچھ واقفِ آدابِ محبّت نہیں مرتے
کچھ صاحبِ اسرار سدا زندہ رہیں گے۔

احساس کے پھولوں کو خزاں چھو نہیں سکتی
اُلفت کے چمن زار سدا زندہ رہیں گے

ہے اپنا جنوں عظمتِ دوراں کی کہانی
عظمت کے طلبگار سدا زندہ رہیں گے

نسبت ہے جہاں میں غمِ انساں سے جن کو
وہ دیدۂ بیدار سدا زندہ رہیں گے

ہے قصرِ حقیقت میں ترے دم سے اُجالا
ساغرؔ ترے افکار سدا زندہ رہیں گے

○

وقت کے رنگیں گلدستہ کو یاد آئے گا ٹھنڈا ہاتھ
جب بکھیریں گے وُہ گیسُو تو مرجائے گا ٹھنڈا ہاتھ

سازِ تغزّل چھیڑنے والو! اے افسانے لکھنے والو!
آج لکیروں کی تفسیریں دوہرائے گا ٹھنڈا ہاتھ

بھیگی پلکیں سوچ کی اُلجھن دامن تھامے پوچھ رہی ہیں
کب تک تارِ گریباں یارو سُلجھائے گا ٹھنڈا ہاتھ

گرم لہو کی بوندیں بوئیں ، تنہائی کی مٹی ڈالیں
پت جھڑ آتے ان شاخوں پر اُگ آئے گا ٹھنڈا ہاتھ

پتھر پتھر جوت جلے گی ساحل ساحل شعلے ہوں گے
بھیگی بھیگی سرد ہوا میں شرمائے گا ٹھنڈا ہاتھ

○

بند گر ہو نہ تیرا خمیازہ
بھُوک ہے زندگی کا دروازہ

چارہ گر بانکپن مُبارک ہو!
زخمِ دِل ہو گئے تر و تازہ

پُوچھ لو! تُربتوں کے کتبوں سے
دے رہی ہے حیات آوازہ

ساحلِ آرزُو سے کرتے ہیں
حسرتوں کے بھنؔور کا اندازہ

چند غزلوں کے رُوپ میں ساؔغر
پیش ہے زندگی کا شیرازہ

○

پھُول کی پنکھڑی سرِ راہ ہے!

بُوند اِک خُون کی سرِ راہ ہے!

منزلِ آرزُو کہاں آئی

آنکھ اُن سے لڑی سرِ راہ ہے

آپ گُذرے کہ جُوئے مے گُذری

مِٹ گئی تشنگی سرِ راہ ہے

جانے پتھر کدھر سے آیا تھا
چوٹ دل پر لگی سرِ راہے

اے سمن بار کھڑکیوں والے
جھانک لینا کبھی سرِ راہے

بن گئی آج حسرتیں ساغرؔ!
مجمعِ بے کسی سرِ راہے

○

جامِ و مِینا ایاغ ہوتی ہے
ہر کلی باغ باغ ہوتی ہے

آپ کے انتظار کی دُنیا!
لامکاں کا سُراغ ہوتی ہے

ایک درویش کی نصیحت بھی
راستے کا چراغ ہوتی ہے

اہلِ وحشت کی زندگی ساغرؔ
کتنی عالی دماغ ہوتی ہے

میکدہ اِن کا ٹھِکانا، نہ حرم ہے ڈیرہ
بادہ کَش اُڑتی ہَواؤں کی طرح مِلتے ہیں

○

درد کے ماروں پہ ہنستا ہے زمانہ بے خبر!
زخمِ ہستی کی کسک سے ہے نشانہ بے خبر!

نکہتوں کے سائے میں بکھرے ہوئے ہیں چند پھول
بجلیوں کی یورشوں سے آشیانہ بے خبر!

حُسنِ برہم کو نہیں حالِ پریشاں سے غرض!
سازِ دل کی دھڑکنوں سے ہے ترانہ بے خبر!

دونوں عالم وُسعتِ آغوش کی تفسیر ہیں!
دیکھنے میں ہے نگاہِ محرمانہ بے خبر!

آپ اپنے فن سے ناواقف ہے ساغؔر کی نظر
لعل و گوہر کی ضیاؤں سے خزانہ بے خبر!

○

تدبیر کا کاسہ ہے تقدیر گداگر ہے
ایوانِ سخاوت کی تعمیر گداگر ہے

تنوٗ رنگ بھرے اس میں پھر بھی یہ رہی مورت
احساسِ مصوّر میں تصویر گداگر ہے

حالات کے دامن میں اقلابِ تغیّر ہے
اس دَور میں انساں کی توقیر گداگر ہے

اب شہرِ بصیرت کی اُونچی ہوئیں دیواریں
چڑھتے ہُوئے سورج کی تنویر گداگر ہے

ہر داغِ تمنّا ہے کشکولِ غمِ ہستی
آہوں سے شکایت ہے تاثیر گداگر ہے

جھنکار کی ہر صورت دریوزۂ نغمہ ہے
ساغرؔ درِ زنداں پہ زنجیر گداگر ہے

○
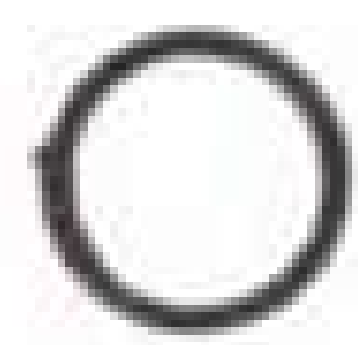
شعلۂ رُخ مست نظر یاد آیا
رشکِ خورشید و قمر یاد آیا

اشک آنکھوں سے چھلکتے ہی رہے
جب کبھی وُہ گُلِ تَر یاد آیا

آج کھولی جو بیاضِ غالبؔ
معدنِ لعل و گہُر یاد آیا

برق چمکی تو نشیمن دیکھا
شاخ ٹوٹی تو ثمر یاد آیا

چاند کی سمت جو دیکھا ساغر
اپنے ارمان کا سفر یاد آیا

○

ترے غم کی تلاوت کر رہے ہیں
ستاروں سے شکایت کر رہے ہیں

جنوں کے تجربوں کی نگہداری
بہ اندازِ فراست کر رہے ہیں

ترے شانوں پہ تابندہ نشاطے
بہاروں کی سخاوت کر رہے ہیں

نہ دے تہمت، ہمیں مدہوشیوں کی
ذرا پی کر عبادت کر رہے ہیں

سحر کے بعد بھی شمعیں جلاؤ!
کہ پروانے شرارت کر رہے ہیں

خُداوندانِ گُلشن! یہ شگوفے
بہاروں سے بغاوت کر رہے ہیں

مُرتّب غم کے افسانوں کو ساغرؔ
بہ اندازِ حکایت کر رہے ہیں

○
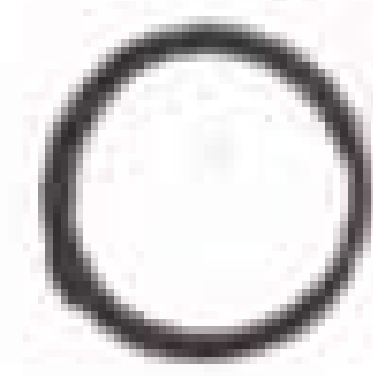
دِلوں کو اُجالو! سحر ہو گئی ہے

نگاہیں ملا لو! سحر ہو گئی ہے

اُٹھو کشتیِ زیست کو ظلمتوں کے

بھنور سے نکالو! سحر ہو گئی ہے

سنوار دو یہ زلفیں کہ شب کٹ چکی ہے

یہ آنچل سنبھالو! سحر ہو گئی ہے

شکستہ اُمیدوں کی پُروائیوں کو
گلے سے لگا لو! سحر ہو گئی ہے

پگھلنے لگا ہے ضمیرِ مشیّت
اُٹھو سونے والو! سحر ہو گئی ہے

بہاروں کے ساغر سے اے مہ جمالو!
ضیائیں اُچھالو! سحر ہو گئی ہے

○
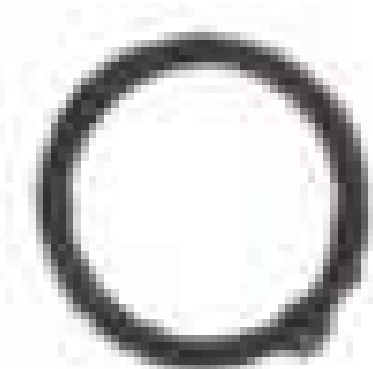
مضمحل دردِ غم ہے بیچارا
پھر مجھے زندگی نے للکارا

سلطنت ہے قناعتِ درویش
ہر نفس ہے سکندر و دارا

داغ ہیں گُل چمن کے سینے پر
اشک افشاں ہے چشم نظّارا

کاش تکمیلِ آرزو کے لئے
پھر میسّر ہو ذوقِ آوارہ

ہیں ضیاؤں کی بخششیں ساغر
ذرّہ ذرّہ ہے آج مہ پارہ

○

پریشاں عکسِ ہستی، آئینہ بے نُور دیکھا ہے
مِری آنکھوں نے افسردہ چراغِ طُور دیکھا ہے

سُرور و کیف کا معیار اپنی ذات ہے ساقی
شرابِ درد سے ہر جام کو معمُور دیکھا ہے

بڑی مُدّت سے آشفتہ اُمیدیں یاد کرتی ہیں
کہیں اُس بزم میں یارو دلِ مجبور دیکھا ہے

یہ دستورِ وفا صدیوں سے رائج ہے زمانے میں

صدائے قُرب دی جن کو اُنہی کو دُور دیکھا ہے

کہیں لختِ جگر کھانے سے ساغرؔ بھوک مٹتی ہے

لہُو کے گھونٹ پی کر بھی کوئی مخمور دیکھا ہے
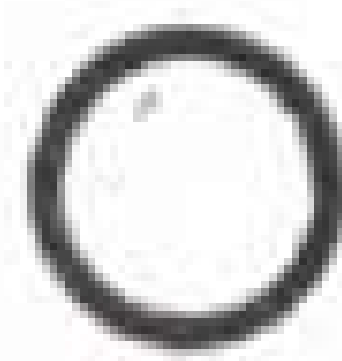
ذرا کچھ اور قربت زیرِ داماں لڑکھڑاتے ہیں
مئے شعلہ فگن پی کر گلستاں لڑکھڑاتے ہیں

تخیل سے گزرتے ہیں تو شبنم کی طرح اُڑ کر
تصوّر میں یہ اندازِ بہاراں لڑکھڑاتے ہیں

تری آنکھوں کے افسانے بھی میخانے ہیں مستی کے
بنامِ ہوش مدہوشی کے عنواں لڑکھڑاتے ہیں

سُنو اے عشق میں توقیرِ ہستی ڈھونڈنے والو!
یہ وہ منزل ہے جس منزل پہ انساں لڑکھڑاتے ہیں

قرارِ دین و دُنیا آپ کی بانہوں میں لرزاں ہے
سہارے دیکھ کر زلفِ پریشاں لڑکھڑاتے ہیں

تمھارا نام لیتا ہوں تو نغمے چونک اُٹھتے ہیں
تمھاری یاد آتی ہے تو ارماں لڑکھڑاتے ہیں

کہیں سے میکدے میں اس طرح کے آدمی لاؤ
کہ جن کی جنبشِ ابرُو سے ایماں لڑکھڑاتے ہیں

چلی آتی ہے خاکِ رہگذر بہر پذیرائی
قدم ساغر قریبِ کوئے جاناں لڑکھڑاتے ہیں

○
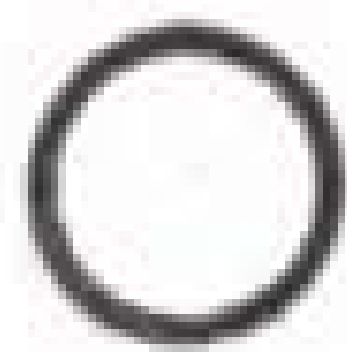
ہیں کتنی سازگار زمانے کی تلخیاں
تُو ہے تو پُر بہار زمانے کی تلخیاں

دیکھی ہیں بارہا مِری چشمِ شعور نے
انسان کا وقار زمانے کی تلخیاں

جو ہو سکا نہ واقفِ آدابِ میکدہ
کرتا رہا شُمار زمانے کی تلخیاں

حیران ہو رہی ہے شگوفے پہ چاندنی!
شاید قفس پہ آج گرفتار ہنس پڑے

مِٹ جائے تیرے نام سے ہر تلخیٔ جفا!
وُہ کام کر کہ بے کس و نادار ہنس پڑے

میرے جنُوں نے آج وہ سجدہ ادا کیا!
بُت خانۂ حیات کے آثار ہنس پڑے

پھر شادماں ہُوئے ہیں خرابے حیات کے
ساغرؔ کِسی کے گیسُوئے خَم دَار ہنس پڑے

O

دِن کٹ گئے جنُوں کے آلام کے سہارے

سب کام چل گئے ہیں اِک جام کے سہارے

بے چینیوں کی منزل ، بیتابیوں کی راہیں

کیا ڈھونڈتا ہے اے دل آرام کے سہارے

حیرت سے دیکھتا ہوں مجروح عشرتوں کو

اِک صُبح ہو رہی ہے اِک شام کے سہارے

شعورِ بزم تک جن کو نہیں ہے
اُنھیں رنگیں ادائیں مل رہی ہیں

ترا آنچل ہوا میں اُڑ رہا ہے
ترانوں کو نوائیں مل رہی ہیں

چلو بادہ کشوں میں تیرہ بختو!
ستاروں کو ضیائیں مل رہی ہیں

وفاؤں کا صلہ ساغر وطن میں
بہت ارزاں جفائیں مل رہی ہیں

ایک مُدّت ہُوئی اِک زمانہ ہُوا
خاکِ گُلشن میں جب آشیانہ ہُوا

زُلفِ برہم کی، جب سے شناسا ہُوئی
زندگی کا چلن مُجرمانہ ہُوا

پھُول جلتے رہے چاند ہنستا رہا
آرزُو کا مکمّل فسانہ ہُوا

داغِ دِل کے شہنشہ کے بِکتے نہیں!
دِل کا مفلس کدہ کب خزانہ ہُوا

راہبر نے پلٹ کر نہ دیکھا کبھی!
راہبرِ راستے کا نشانہ ہُوا

ہم جہاں بھی گئے ذوقِ سجدہ لئے
ہر جگہ آپ کا آستانہ ہُوا

دیکھو مضراب سے خُوں ٹپکنے لگا
ساز کا تارِ مرگِ ترانہ ہُوا

پہلے ہوتی تھی خُوئے وفا پروری
اب تو ساغر! قِصّیہ پُرانا ہُوا

○
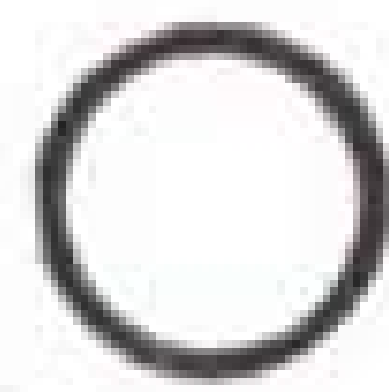
ہَوا بھیگی بھیگی فضا بھیگی بھیگی
چلو آج مانگیں دُعا بھیگی بھیگی

گھٹاؤں کو رحمت کی جوش آگیا ہے
کوئی ہو گئی ہے خطا بھیگی بھیگی

دیارِ تمنّا میں دَم گھُٹ رہا ہے
ذرا چھیڑ مطرب نوا بھیگی بھیگی

ذرا صندلیں ہاتھ نزدیک لاؤ
سُلگنے لگی ہے حنا بھیگی بھیگی

بھٹکنے لگیں بدلیاں حسرتوں کی
چمن در چمن ہے صبا بھیگی بھیگی

○

راہِ پُر شور سے، منزلِ دار سے
ہم اُلجھتے رہے، گیسوئے یار سے

میرا ہر نقشِ پا، خضر کی داستان
کوئی پوچھے مرے عزمِ بیدار سے

ہو سکے آپ عنواں کوئی دیجئے!
داستاں بن گئی حرفِ اظہار سے

یُوں بھی ہوتا ہے ، شامِ وفا دوستو!
ٹُوٹ جاتا ہے دِل اُن کے اقرار سے

چشمِ ساقی تری عُمر ہو جاوداں!
پی گئے زہر بھی تیرے اِصرار سے

دوشِ ساغر نے تکیہ بنایا اُنھیں
جتنے پتھّر گرے اُن کی دیوار سے

○
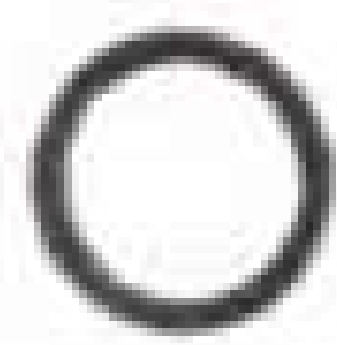
میرے تصوّرات ہیں تحریریں عشق کی
زندانیٔ خیال ہوں زنجیریں عشق کی

تعبیرِ حُسن ہے دِلِ مجروح کا لہُو!
چھینٹے پڑے تو بن گئیں تصویریں عشق کی

شامِ خزاں کو صُبحِ بہاراں بنا دیا
ترتیبِ زیست بن گئیں تعزیریں عشق کی

داغِ فراق، زخمِ وفا، اشکِ خوں فشاں
روزِ ازل سے ہیں یہی جاگیریں عشق کی

ساغر جہانِ شوق ہیں دستورِ جاوداں!
اہلِ نظر کے نام سے تفسیریں عشق کی

○

ساقی کی اِک نگاہ کے افسانے بن گئے
کچھ پھول ٹوٹ کر مرے پیمانے بن گئے

کاٹی جہاں تصوّرِ جاناں میں ایک شب
کہتے ہیں لوگ اس جگہ بُت خانے بن گئے

جن پر نہ سائے زُلفِ غزالاں کے پڑ سکے
احساس کی نگاہ میں ویرانے بن گئے

جو پی سکے نہ سُرخ لبوں کی تجلّیاں
دُنیا کے تجربات سے انجانے بن گئے

ساغرؔ وہی مقام ہے اِک منزلِ فراز
اپنے بھی جس مقام پہ بیگانے بن گئے

○

جگر کے زخم جاگے ایک شامِ نوبہار آئی
نہ جانے تیری گلیوں سے فضائے مُشکبار آئی

اسیروں نے نئی دُھن میں کوئی فریاد چھیڑی ہے
شگوفے مُسکرائے اِک صدائے کیف بار آئی

ہے گردِ کارواں کی گود میں شاید کوئی منزل
سُنو اے رہنماؤ! اِک نویدِ لالہ زار آئی

کسی رندِ جہاں کش نے کوئی پیمانہ توڑا ہے
تمناؤں کے گلزاروں میں اِک صوتِ ہزار آئی

جبینِ عشق نے سجدے کئے تقدیسِ الفت کے
چمن میں رقص فرماتی ہوئی موجِ خمار آئی

شگفتہ کس قدر مجموعۂ اشعارِ ساغرؔ ہے
صبا لے کر چمن میں جیسے پیغامِ قرار آئی

○
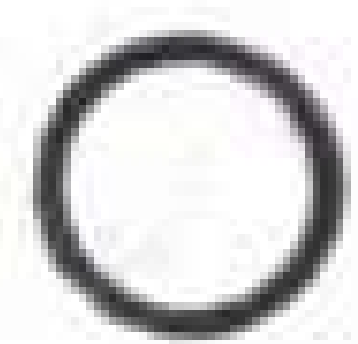
غم کے مُجرِم خُوشی کے مجرِم ہیں
لوگ اب زندگی کے مُجرِم ہیں

اَور کوئی گُناہ یاد نہیں!
سجدۂ بے خودی کے مُجرِم ہیں

استغاثہ ہے راہ و منزل کا!
راہزن رہبری کے مجُرِم ہیں

مے کدے میں یہ شور کیسا ہے
بادہ کش بندگی کے مُجرم ہیں

دشمنی آپ کی عنایت ہے
ہم فقط دوستی کے مُجرم ہیں

ہم فقیروں کی صورتوں پہ نہ جا!
خدمت آدمی کے مُجرم ہیں!

کچھ غزالانِ آگہی ساغر
نغمہ و شاعری کے مُجرم ہیں
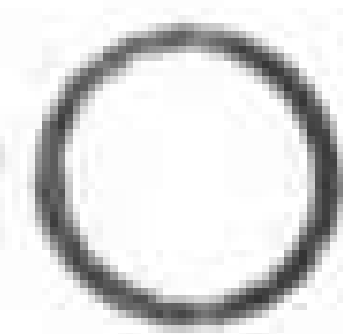
تہذیبِ بے نقاب کی آنکھیں نکال دو
اُس قوم کے شباب کی آنکھیں نکال دو

جس نے سماعتوں کو دیا درسِ بے خودی
اُس نغمۂ رباب کی آنکھیں نکال دو

جس میں نہ ہو بصیرتِ انساں کی چاندنی
اُس شیشۂ شراب کی آنکھیں نکال دو

اب منزلِ دعا کی ضرورت نہیں رہی
ہر عزمِ کامیاب کی آنکھیں نکال دو

سا ہر بکھر سکے نہ جہاں نکہتِ خُودی!
اُس قریۂ گلاب کی آنکھیں نکال دو

○

مرے چمن کو جہاں میں یہ سرفرازی ہے
ہر ایک پھول نئی زندگی کا غازی ہے

بہاریں بھی سلگتے رہے ہیں کاشانے
کہ یہ بھی ایک طرح کی شرر طرازی ہے

میں اُس مقام پہ تجھ کو تلاش کرتا ہوں
حقیقتوں کا تصرّف جہاں مجازی ہے

خُدا کے نام پہ پہلا سبُو اُٹھاتے ہیں
کہ مے کشوں میں یہی رسمِ پاکبازی ہے

روش روش پہ ہیں برق و شرر کے ہنگامے
مجھے یقیں ہے بہاروں کی کارسازی ہے

لکھو! یہ عظمتِ ہستی کے باب میں ساغرؔ
کہ غزنوی کی جلالت غمِ ایازی ہے
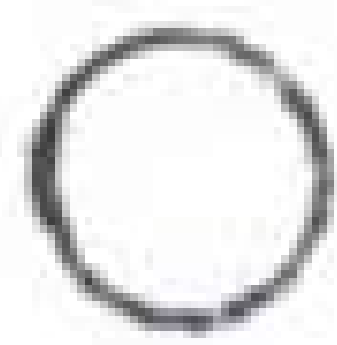
ہر تمنا کا چہرہ شفق فام تھا
وقت کے ہاتھ میں امن کا جام تھا

زندگی کی صراحی میں تھے قہقہے
ہر ستارہ یہاں میرا ہم کام تھا

یہ بھی دیکھا گلستاں کے آئین میں
صید کا زخم صیّاد کا دام تھا

موسمِ گُل میں نغمات جلتے رہے
غنچہ غنچہ مئے درد کا جام تھا

میری آنکھیں سُرورِ تمنّا لئے
تیری زُلفوں میں بھی کیفِ الہام تھا

فکرِ ساغر سے زندہ رہی زندگی
کس قدر سردِ احساس کا لام تھا

گدڑی کے پھٹے ٹکڑے ساغرِ اجسام تخیل کیا ڈھانپیں

فریاد کے نقطے حیراں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے

حادثے شوخ اداؤں کی طرح ملتے ہیں

بت بھی اب ہم سے خداؤں کی طرح ملتے ہیں

○

ہر تمنّا کا لہو کرتے چلیں
احترامِ رنگ و بُو کرتے چلیں

بے خودی کی نذر کر دیں زندگی
بیعتِ جام و سبُو کرتے چلیں

جس زباں میں بیکسوں کی بات ہو!
اُس زباں میں گفتگو کرتے چلیں

یہ گھٹاؤں سے برستی مستیاں!
گر اجازت ہو وضُو کرتے چلیں

انقلابِ دیدۂ و دِل کے لیے
آئینوں کو رُوبرو کرتے چلیں

کھو کے کچھ پانا یہاں دشوار ہے
احتیاطاً جستجو کرتے چلیں

فکرِ ساغرؔ کی اداؤں میں بیاں!
داستانِ آرزُو کرتے چلیں

○

مول اگر بِک جائے ہستی

جنسِ محبّت پھر بھی سستی

تُو بھی چُپ ہے مَیں بھی چُپ

دُنیا ہے پتّھر کی بستی

مست خلائیں میرے سجدے

کرتا ہوں آفاق پرستی

درد میں جینا اپنی ہمت
آگ میں جلنا کس کی ہستی

اپنی بادہ خونِ وفا ہے
اپنی بوتل فاقہ مستی

چہروں کو بدنام نہ کردے
آئینوں کی چہرہ دستی

کون بلندی سے ٹکرایا
چیخ رہی ہے ساغر پستی

○

میرے آنسو ہیں کسی شامِ غریباں کے دیئے
جگمگاتے ہی رہیں گے یہ چراغاں کے دیئے

سائے کی طرح منڈیروں سے گذرنے والے!
جل رہے ہیں ابھی ٹوٹے ہوئے ارماں کے دیئے

ظلمتِ دہر میں ہر سمت اُجالا کر دوں!
کاش! مِل جائیں مجھے کوچۂ جاناں کے دیئے

اپنے دامن کی ہواؤں سے بجھا دو آکر!
دِل کی دُنیا نہ جلا دیں غمِ دَوراں کے دیئے

جیسے احساس کی پَت جھڑ میں شرارے جاگیں
پھر خیالوں میں جلے جنّتِ پیماں کے دیئے

میرے افسانے میں توقیر ہے شب کی ساغر
ماہ و انجم مرے افکار میں عنواں کے دیئے

○

درد کے ماروں پہ ہنستا ہے زمانہ بے خبر
زخمِ ہستی کی کسک سے ہے نشانہ بے خبر

نکہتوں کے سائے میں نکھرے ہوئے ہیں چند پھول
بجلیوں کی یورشوں سے آشیانہ بے خبر

حُسنِ برہم کو نہیں حالِ پریشاں سے غرض
سازِ دل کی دھڑکنوں سے ہے ترانہ بے خبر

دونوں عالم وسعتِ آغوش کی تفسیر ہیں
دیکھتے ہیں ہے نگاہِ محرمانہ بے خبر

آپ اپنے فن سے ناواقف ہے ساغرؔ کی نظر
لعل و گوہر کی ضیاؤں سے خزانہ بے خبر

○
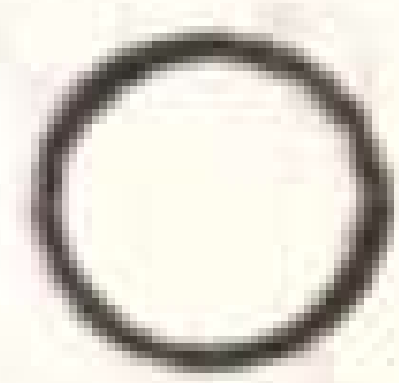
تیرے جوڑے کے پھول مرجھائے
عشق کی بندگی کے کام آئے

صبح تیرے جلو میں روشن ہے
میرے ہمراہ شام کے سائے

بے صدا ہے ترانۂ منصور
عقدۂ دار کون سلجھائے

روشنی تھی تو دُور تھے احباب
اب اندھیروں میں ڈھونڈنے آئے

موت کی گونجتی ہواؤں میں
بارہا نغمے موت کے گائے

اس درندوں کی بھیڑ میں ساغرؔ
کاش انسان کوئی کہلائے

○

سوزِ تصوّرات سے تصویر جل گئی
سپنوں میں آگ لگ گئی تعبیر جل گئی

ساقی نے اس ادا سے بکھیری ہیں بجلیاں
پیمانۂ حیات کی تنویر جل گئی

لاشے تڑپ رہے ہیں سرِ مقتلِ وفا
بسمل کا رقص دیکھ کے شمشیر جل گئی

تاثیرِ آہِ سرد کی صورت پہ ہنس پڑی
آہوں کو یہ گلہ ہے کہ تاثیر جل گئی

○

دُکھ درد کے طوفان ہیں آلام کے جنگل
یادیں ہیں تری جیسے کہ آسام کے جنگل

تدبیر ہے تقدیر کی بے نام پرستش
اذہان میں آباد ہیں الہام کے جنگل

پلکوں کے تلے معنئ و مفہوم کی جھیلیں
زلفوں کے گھنے سائے ہیں ابہام کے جنگل

ساقی تری مخمور نگاہوں کے سہارے
گلزار کیے ہیں غمِ ایّام کے جنگل

○

مانگی ہے اس دیار میں دونوں جہاں کی بھیک
لیکن ملی ہمیں دلِ ناکامراں کی بھیک

ایسے بھی راہِ زیست میں آئے کئی مقام
مانگی ہے پائے شوق نے عزمِ جواں کی بھیک

بے نُور ہو گئی ہیں ستاروں کی بستیاں
ساقی عطا ہو بادۂ شعلہ فشاں کی بھیک

اَب اَور کیا تغیّرِ تقدیر چاہیئے
جھولی میں ڈال دی ترے نام و نشاں کی بھیک

خود بِک گئے حیات کی نیلام گاہ میں
وُہ بانٹتے تھے جو کبھی کون و مکاں کی بھیک

دو چار پتّیوں پہ ہے رنجش بہار سے
سائل نے مانگ لی ہے کہاں گلستاں کی بھیک

اللہ اُن کے نقشِ کفِ پاء کی خیر ہو !
ذرّوں کو دے گئے جو مہ و کہکشاں کی بھیک

ساغؔر خوشا کہ گوہرِ اُمّید پا لیا
قسمت سے ہات آئی غمِ دوستاں کی بھیک